آغازِ رسالت

بعثت سے قبل انبیاء کا ذہنی سفر قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعہ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ - ۵۲)

اے نبی تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ - ۷)

اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا پھر تمہیں راستہ بتایا۔

عقلی معرفت سے الہامی ایمان تک اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے اُنہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے، وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر اُن کا دل گواہی دیتا تھا، اب اُنہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور اُنہی صداقتوں کا مشاہدہ اُنہیں کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے اُن کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار بتکرار بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً۔ (آیت - ۱۷)

پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا۔ (یعنی عقلی و فطری ہدایت پر)، اُس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن)، اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما

اور رحمت کے طور پر موجود تھی۔ (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کرسکتا ہے؟)

پھر اس کے بعد یہی مضمون حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِۦ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَٰرِهُونَ۔ (آیت – ۲۸)

اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی و نبوت) سے بھی نوازا اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم زبردستی اسے تمہارے سر چپیک دیں؟

بینۃٌ من الرب پھر اسی مضمون کو آیت ۶۳ میں حضرت صالح اور آیت ۸۸ میں حضرت شعیب دہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کرکے (جسے اوپر کی آیات میں "بینۃٌ من الرب" سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید اور معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر اور عقلِ عام (COMMON SENSE) کا استعمال اُن قیاس آرائیوں اور اُس ظن و تخمین (SPECULATION) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اس طرح آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ قبل نبوت کے جو حالات ہم پچھلے باب میں بیان کرچکے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نبی ہونے سے پہلے ہی شرک سے پاک اور توحید کے قائل تھے۔ آپ نے ہوش

سنبھالنے کے بعد کبھی اپنی قوم کے مشرکانہ عقائد کو قبول نہیں کیا، اس کی مشرکانہ عبادات میں حصہ نہیں لیا، بتوں اور بت پرستی سے ہمیشہ بیزار رہے، اور بتوں پر جو قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ان سے اجتناب فرماتے رہے۔ زمانۂ قبل نبوت میں آپ کا حال اپنی قوم کے ان حُنفاء سے ملتا جلتا تھا جن کا ذکر ہم اس جلد کے دوسرے باب میں کر چکے ہیں۔　　(اضافہ از مؤلف)

حضوؐر کا دورِ تحنُّث محدثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروَہ بن زُبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں[۱]۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حراء میں رہ کر عبادت کرنے لگے[۲]۔ (حضرت عائشہؓ نے تحنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہری نے تعبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔　　(تفہیم القرآن۔ جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق)

غارِ حراء میں خلوت گزینی کی وجہ اس دور میں جن وجوہ سے آپؐ مکہ کی آبادی کو چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حراء کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے اس کے وجوہ پر کچھ روشنی سورۂ الم نشرح کی اس آیت سے پڑتی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِىٓ أَنقَضَ　　اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ

۱۔ بیہقی کی روایت ہے کہ یہ کیفیت نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ (اضافہ از مؤلف)

۲۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت کے بعد آپ اور زیادہ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ ورنہ آپ کی خلوت پسندی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ حراء میں گزارتے۔ چند روز کا سامانِ خوراک لے کر جاتے، پھر گھر واپس آ کر مزید چند روز کا سامان لے جاتے تھے۔ ابن اسحاق نے یہ بیان نہیں کیا کہ حضوؐر نے حراء میں جا جا کر قیام فرمانے کا یہ سلسلہ کب سے شروع فرمایا تھا۔　　(اضافہ از مؤلف)

ظَهْرَكَ (آیات ۲-۳) اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔

اس آیت میں وِزْر کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حسّاس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپ کُڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ (تفہیم القرآن جلد ششم، الم نشرح، حاشیہ ۲)

سچے خواب جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی زمانۂ نبوت کے ہر دور میں جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح آیت ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث قُدسیہ زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۳)

ابتدائے وحی جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہو گئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ پر غارِ حراء میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔[۱] بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے فرمایا "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے" پھر سارا قصہ آپ نے اُن کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔[۲] انھوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم، آپ

---

[۱] ابن اسحاق نے عُبَید بن عمر اللَّیثی سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خواب میں جبریلؑ نے آکر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہوئی تحریر مجھے دکھائی جس میں سورۂ علق کی ابتدائی آیات لکھی ہوئی تھیں اور مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر انھوں نے مجھے اس طرح بھینچا کہ میں سمجھا کہ میری جان نکل جائے گی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو۔ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ گویا تمہید تھی اُس معاملہ کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا، جس کا ذکر حضرت عائشہؓ والی حدیث میں آیا ہے۔ (اضافہ از مؤلف)

[۲] اس خوف کے بہت سے وجوہ علماء نے بیان کیے ہیں جن کی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کے بارِ گراں کا تصور کر کے حضورؐ لرز جاتے تھے اور آپ کو بار بار خیال آتا تھا کہ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنے آپ کو کوئی بڑی ہستی نہ سمجھتے تھے اور کوئی ایسا ادعا آپ کے ذہن میں نہ تھا کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہی ہونا چاہیے اور کوئی زعم آپ کو نہ تھا کہ میں ہی یہ عظیم کام انجام (باقی بر صفحہ آئندہ)

کو اللہ تعالیٰ کبھی رُسوا نہ کرے گا۔[۱] آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔"

پھر وہ حضورؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں حضرت خدیجہؓ آپ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کے چچازاد بھائی تھے، زمانہ جاہلیت میں بُت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سُنیے۔[۲] (ابو نعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہ نے خود سارا قصہ ورقہ کو سنایا) ورقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔[۳] کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے"؟ ورقہ نے کہا ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق)

اس واقعہ سے کیا نتائج نکلتے ہیں یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دینے کی قوت و اہلیت رکھتا ہوں۔ (اضافہ از مولف)

۱؎ ایک روایت میں الفاظ ہیں اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رنج میں مبتلا نہ کرے گا۔ (اضافہ از مولف)

۲؎ حضورؐ کو اُن کا بھتیجا اس لیے کہا کہ ان کی تیسری پُشت میں عبدالعزّیٰ حضورؐ کی چوتھی پُشت میں عبد مناف کا بھائی تھا۔ (اضافہ از مؤلف)

۳؎ حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ حضرت عیسیٰ کے لیے تو نبوت کی بشارت پیدائش سے بھی پہلے دے دی گئی تھی، البتہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت اُسی طرح اچانک ملی جس طرح حضورؐ کو دی گئی (اضافہ از مؤلف)

کا طالب یا متوقع ہوتا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حراء میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تامل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکّہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی وَسوَسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی بول اُٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۃ العلق)

صورتِ واقعہ کا تجزیہ نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لیے کوئی تیاری آپ پہلے سے کر رہے تھے اور اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے۔ لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس حالت میں جب یکایک غارِ حراء کی اُس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر اس پہلے

عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پہ طاری ہونی چاہیئے، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنہوں نے طبعِ مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا؟[له] لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں، اب لوگ میرا مذاق اُڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپؐ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔

پہلی وحی پر ردِ عمل اسی وجہ سے جب آپؐ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ "مجھے اُڑھا دو، مجھے اڑھا دو" گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھہرا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا، اور فرمایا:

"لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي" — مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔

انہوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ:

کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابداً۔ انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔	ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آپؐ کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں، اور تمام نیک

له بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عُجب وخود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب آپؐ نبوت کے منصبِ عظیم پر یکایک مامور کر دیے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لیے رب کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑے۔ (رسائل ومسائل، حصہ سوم ص ۲۳۲)

کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ اُنھوں نے حضورؐ سے کیفیت سن کر بلاتامل تصدیق کی کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے جوانی تک آپؐ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انھوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیماتِ انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور پکّی نبوت ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۲۹ تا ۲۳۲)

اگر پہلے سے شوقِ نبوت ہوتا

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے تو غارِ حراء والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غارِ حراء کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے؟

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دُکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر

حقیقت ہے - اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی تھا - وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے - پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنّع سے ممیّز کر سکتے تھے - عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی، بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی - انہوں نے بھی آپ کی زبان سے حراء کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا - کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں عَلانیہ اِس تجربے سے دوچار ہوتا ہے - اسی چیز نے ان کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامّل اس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے -

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے - اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے[۱]-

(تفہیم القرآن جلد سوم، القصص حاشیہ ۱۰۹)

پہلی وحی کا مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

> "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی - پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا - انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا - اس پیغام میں آپ کو یہ نہیں بتایا گیا

---

[۱] مثلاً سورۂ یونس کی آیت قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم ... الخ
نیز سورۂ شوریٰ کی آیت ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان ... الخ
مرتب

تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں، اور آگے کیا کچھ آپؐ کو کرنا ہے۔ بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربے سے ہوا ہے اس کا اثر دور ہو جائے، اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔[۵۱] (تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ مدثّر)

یہ پہلی وحی جو حضورؐ پر نازل ہوئی اس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ’’ پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

(العلق۔ آیت ۔ ۱)

فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو! تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپؐ اسی طرح پڑھتے جائیں، تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں[۵۲]

’’اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو‘‘ یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظِ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ کا رب کون ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

’’جس نے پیدا کیا‘‘ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے

---

[۵۱] اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اُس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل آگے آئے گی۔ (اضافہ از مؤلف)۔

[۵۲] سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ ’’جبریلؑ نے آ کر ایک ریشمی تھیلی حضورؐ کے سامنے پیش کی جس میں ایک تحریر تھی، اور کہا کہ پڑھو‘‘ (حاشیہ از مؤلف)

کہ اس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (آیت-۲) جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتداء کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ عَلَقٌ جمع ہے عَلَقَہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔[۱]

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (آیت-۳-۴) پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

یعنی یہ اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتداء کر کے اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ (آیت-۵) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اسی پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیتہ الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ:

"وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ" اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷

وہ خود چاہے۔" (البقرہ۔ ۲۵۵)

جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہِ راست مخاطب ہے، اس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس سے ایک مدت بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے[1] (باقی)

(تفہیم القرآن، جلد ششم، العلق، حواشی ۱ تا ۶)

---

[1] مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ المدثر۔

- سرزمین مسجدِ اقصیٰ کی دلخراش تاریخ
- عربوں کے خلاف اسرائیلی جارحیت کی داستان
- فلسطین پر یہودی کیسے قابض ہوئے؟
- یہودی جارحیت کی قدیم تاریخ اور جدید سازش
- ہرزل، وائزمین، لارڈ بلفور اور مجلسِ اقوام کی ریشہ دوانیوں کی تفصیل
- مزعومہ اسرائیلی ریاست کے حدود
- اسرائیلی ریاست کے قیام اور توسیع کا مدلل جائزہ
- آزادیِ فلسطین اور یہودیوں کی سرکوبی کے لیے صحیح لائحہ عمل

ترتیب: مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی کاپی ۴۰ پیسے

پچاس پیسے کے ٹکٹ بھیجکر "سانحہ مسجد اقصیٰ" منگوا کر مطالعہ کیجیے۔

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

لیبیا میں سرقہ وحرابہ کی حدود کا قانون

(۳)

(از جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضاء لیبیا)

بسلسلہ دفعہ ۲۱

(۳) ہاتھ رسغ (گٹے، پہنچے) پر سے کاٹا جائے گا، جہاں ہاتھ کا جوڑ ہوتا ہے، اور پیر مفصل (ٹخنے) پر سے[1]۔

(۴) مقطوع شخص طبی نگرانی میں اس وقت تک رہے گا جو مدت وہ سرجن متعین کرے جس نے آپریشن کیا ہے۔ یہ نگرانی ہسپتال میں یا اس کے باہر دونوں جگہ ہوگی، اس کے لیے تمام احتیاطی تدابیر کی جائیں گی، اور ضروری علاج فراہم کیا جائے گا کہ دوسری محتمل تکلیفیں یا نقصانات پیش نہ آجائیں[2]۔

---

[1] یہ تقریباً جمہور فقہائے اہل سنت کی رائے ہے۔ ابوثور اور امام احمد کا ایک قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ پیر اس طرح کاٹا جائے گا کہ ایڑی کا حصہ بچ جائے، مزید تفصیل سرقہ وحرابہ کی مفصل بحث میں کروں گا۔

[2] یہ تمام احتیاطی تدبیریں ضروری اور شرعی ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود ہے۔ " فاقطعوہ واحسموہ" حسم کے معنی یہ ہیں کہ خون بہنے والی رگوں کو گرم لوہے سے داغا جائے۔ یا المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ گرم تیل میں ڈالا جائے تاکہ خون نہ بہے۔ امام شافعی اور احمد کے نزدیک حسم کرنا مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب ہے اور اس کی دلیل اور ضرورت فقہ حنفی کی کتابوں میں اس طرح درج ہے کہ "اگر حسم نہ کیا جائے گا تو ہلاکت اور تلف کی نوبت آجائے گی اور حد زاجرہ ہوتی ہے نہ کہ متلف۔ اس قول اور دلیل کی رو سے احتیاطی تدابیر نہ صرف یہ کہ مستحسن ہیں بلکہ واجب ہیں تاکہ مزید نقصان، امراض یا موت واقع نہ ہو جائے۔ لیبی مقنن نے اسی انسانی اور شرعی حکمت کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ عصور اولی میں خون روکنے اور نقصانات سے بچانے کا بہترین طریقہ وہی رائج تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ روح شریعت مصلحت شریعت اور تقاضائے شریعت یہی ہے کہ ہر زمانے میں بہترین اور جدید ترین احتیاطی طریقے استعمال کیے جائیں۔ اس لیے ڈاکٹر، سرجن، ہسپتال، دوائیں اور (باقی صفحہ آئندہ)